قتل گاہِ زندگی

مریم جہانگیر

رات کا عمیق اندھیرا روشنیوں کو نگلنے کے در پے تھا مگر فطری قمقموں یعنی چاند' ستاروں اور برقی قمقموں نے شہر کے بیچوں بیچ بنے اس پارک کو روشنی کے ہالے میں مقید کر رکھا تھا۔ تقریباً رات کے دس بجے ایک ٹیکسی پارک کے آہنی دروازے کے سامنے آ کر رکی۔ ٹیکسی ڈرائیور کی پیشانی پر دن بھر کی تھکاوٹ مانند افشاں بکھری ہوئی تھی مگر طمانیت آنکھوں کے سرخ ڈوروں میں ہلکورے لے رہی تھی' شاید اس کا سبب یہ تھا کہ وہ پیسے اور پیٹ بھرنے کے لیے کوئی سواری لے کر پارک میں نہیں آیا تھا بلکہ اپنی جوان ہوتی دو بیٹیوں اور نصفِ بہتر کے ساتھ دن بھر کی تھکن اتارنے آیا تھا۔ رات کے اس پہر یہاں آنے کا مقصد شاید یہ بھی تھا کہ اس وقت داخلی دروازے پر چوکیدار صرف چوکیداری کرتا تھا اور آنے والوں کو ٹکٹ نہیں بیچتا تھا۔ لاابالی مگر حساس ماہین نے دھیرے دھیرے چلتے ہوئے داخلی سیڑھیاں عبور کیں اور نرم نرم گھاس پر اپنے پیر رکھ دیئے اس کے عقب میں بڑی بہن شاہین اور اس کی روز بروز کمزور پڑتی ماں دھیرے دھیرے باتیں کرتے چلے آرہے تھے۔ عبدالرشید نے گاڑی پارکنگ میں کھڑی کی اور ان کے پاس آگیا۔ پندرہ سالہ ماہین کے پیچھے چلتے چلتے وہ پارک کے نسبتاً سنسان گوشے میں آگئے جہاں جھولے لگے ہوئے تھے۔ گھاس پر بیٹھ کر عبدالرشید انہیں دن بھر کی سواریوں کے قصے سناتا رہا۔ کسی برقعے والی کا قصہ جو عبدالرشید کو ڈر کے مارے گھورے جارہی تھی۔ اس کی گھبراہٹ اس کے پہلی دفعہ تنہا ٹیکسی میں بیٹھنے کی چغلی کھارہی تھی۔ ان بڑے میاں کا قصہ جنہیں بات سننے کے لیے کان کے آلے کی اشد ضرورت تھی مگر وہ اسے جیب میں رکھنا زیادہ مناسب سمجھتے تھے اور نتیجتاً دو جمع دو کا جواب آٹھ دیتے تھے۔

"ابا وہ سامنے سے پانچ روپے والی آئسکریم تو لادو۔" شاہین نے باپ سے خواہش کا اظہار کیا۔ آہ...... غریب بچوں کی غریب سی خواہش۔ حساس بیٹیوں کے نازک جذبات اور ہاں احساس کرنے والے درد مند دل۔

عبدالرشید مسکرایا اور اُٹھ کر چل دیا۔ پارک سے باہر جہاں اونچی اونچی دکانوں کے ساتھ کون آئس کریم والے کا کھوکھا نما ڈربہ ٹائپ ٹھکانہ تھا۔ عبدالرشید کے جاتے ہی ایک گیارہ بارہ سالہ بچہ ان کے پاس آگیا۔ اس سردی کے موسم میں جب تن ڈھکنا اور ڈھانپنا کپڑوں کا مقصد نہیں ہوتا بلکہ جسم کو ٹھٹھرنے سے باز رکھنا اور گرم رکھنا اصل مقصد ہوتا ہے۔ اسی سردی کے موسم میں وہ معصوم ننگے پیر تھا اس کے پاؤں میں جوتی نہیں تھی۔ کالے کھردرے پاؤں اس کی شفاف آنکھوں سے ذرا میل نہیں کھاتے تھے۔ شلوار قمیص میں ملبوس اس بچے کے ہاتھ میں ایک بیگ تھا اور ہاتھوں میں چند باسی نمکو کے پیکٹس چھوٹے چھوٹے ان لفافوں کو موم سے بنایا گیا تھا۔ اور پھر شعلوں سے بند کیا گیا تھا۔ یعنی جدید حفظانِ صحت کے اصولوں سے واضح انحراف۔ قمیص پر بھی پیوند لگے ہوئے تھے۔ خاکستری رنگ کی قمیص اب قریب قریب کالی ہو چکی تھی۔ گردن پر میل کے نشان تھے ایسا گہرا میل جو شاید مانجھنے سے بھی نہ اترے۔ ہاتھوں پر پڑی کھردری لکیریں دور سے اس قدر واضح تھی کہ دیکھنے سے بھی وحشت ہوتی تھی۔ پپڑی جمے ہونٹ اسی لمحے ہلے تھے جب ماہین اس کا تفصیلی جائزہ لے رہی تھی۔

"باجی جی لے لو پانچ روپے کا ایک پیکٹ ہے باجی لے لو۔" گڑگڑاہٹ اور التجا سے ماہین کا دل پسیجا تھا مگر ماں کا تنبیہہ کرتا لہجہ گونج اٹھا۔

"ہمیں نہیں چاہیے۔"

"پانچ روپے میں دو لے لو باجی' تم دو لے لو دیکھو آج صبح سے ایک بھی پیکٹ نہیں بک سکا۔ میرے پیروں کو دیکھو سردی سے یخ ٹھنڈے ہورہے ہیں۔ تمہارے پانچ روپے سے کوئی سستا سا جرابوں کا جوڑا لے لوں گا۔ جوتی تو پانچ روپے میں آ نہیں سکتی۔" اس نے شاید اپنا

ہی تمسخر اڑایا تھا۔
"سنو تمہارا نام کیا ہے؟" شاہین نے پوچھا۔
"نام...... باجی نام کیا ہوتا ہے؟ باجی تم ہی لے لو ایک پکٹ لے لو۔" وہ شاید آگہی کی پست ترین سطح سے بھی نچلی زندگی بسر کررہا تھا بھی شناخت سے ناواقف تھا۔
"تمہیں گھر والے کیا کہہ کر پکارتے ہیں؟" اب کے ماہین نے سوال کیا۔
"باجی گلو۔" وہ شرمندہ سا ہو گیا شاید اپنی کم فہمی کا ادراک ہو گیا تھا اسے۔
"چلو بھاگو یہاں سے‘ ہمیں معاف کرو کہہ جو دیا نہیں چاہئے سمجھ نہیں آتا‘ کون سی زبان سمجھتے ہو۔" اپنی بیٹیوں کی بڑھتی ہمدردی دیکھ کر کفایت شعار ماں کو اسے بھگانا ہی پڑا۔
عبدالرشید تب تک کون آئسکریم لا چکا تھا۔ بیٹیوں کے منہ پھولے ہوئے تھے۔ باپ کے آتے ہی سارا قصہ حرف با حرف سنا دیا۔ عبدالرشید باہر نکلنے والا انسان تھا اور اس کی بیٹیاں صرف اپنے تین مرلے کے مکان سے مانوس تھی۔ تجربہ اور عمر انسان کو وہ کچھ سکھا‘ پڑھا اور سمجھا دیتا ہے جو درس گاہیں لاکھ کوشش کے باوجود دماغ میں نہیں انڈیل سکتیں۔
عبدالرشید وہاں سے اٹھا پارک میں تا حال موجود اس بچے کو تھاما اور بیٹیوں کے پاس لے آیا۔ بیٹیاں خوش ہو گئیں کہ شاید ننھے لڑکے کے پاؤں میں سردی لگنا کم ہو جائے گی اور ان کی ماں تھوڑی سی خفا کہ یہ تو صرف پیسوں کا ضیاع ہے۔
"ہاں بھئی تمہارے پاس جوتے نہیں ہیں؟" عبدالرشید نے اس کا ہاتھ تھام کر پوچھا۔
"نہیں جی اس نگوڑی سردی کا تو کوئی علاج نہیں ہے میرے پاس نہ ایندھن نہ کپڑا نہ رضائی نہ کمبل نہ جوتے نہ سویٹر۔" اب کے بچے کی آواز میں سرسراہٹ و کپکپاہٹ تھی۔ وہ اس بازو کو کسمسا رہا تھا جس میں وہ کالا سا بیگ تھام رکھا تھا۔ عبدالرشید نے آناً فاناً اس سے وہ بیگ جھپٹ لیا اور زپ کھول دی۔ وہاں پر بیٹھے تین نفوس کی آنکھوں میں حیرانی اور ملامت تھی جبکہ جھوٹ کا احساس آنسو بن کر بچے کے گالوں پر بہہ رہا تھا اور عبدالرشید کی آنکھوں میں اطمینان تھا کیونکہ وہ جانتا تھا کہ ایسا ہی ہوگا۔
جوتوں کے چار پانچ جوڑے ان سب کا منہ چڑا رہے تھے دو بدرنگ جرابوں کے جوڑے بھی اپنی حالت زار پر شرمسار تھے جبکہ نمکو بکھری ہوئی پڑی تھی ان جوتیوں کے جوڑوں کے نیچے۔ ماہین اور شاہین حیران تھیں کوئی اتنا جھوٹا بھی ہو سکتا ہے؟ وہ جو یہاں اس معصوم آنکھوں والے بچے کے پیچھے اپنی ماں سے ناراض ہوئے بیٹھی تھیں اس بچے کا چہرہ کتنا مکروہ تھا۔ جھوٹ اور منافقت کی دلدل‘ وہ دنیا کا حصہ اور منجھا ہوا کھلاڑی تھا۔ شناخت بتانے کی آگہی نہ تھی مگر مکر و فریب کے کتنے گہرے جالے بن لیتا تھا۔
صرف پیسے کمانے کے لیے اس نے اپنے پاؤں کو سردی میں اکڑنے دیا؟ وہ اس کی سن ہوتی پیروں کی نمایاں رگیں جنہیں دیکھ کر رحم بجلی کے کوندے کی مانند لپک پڑتا ہے وہ رگیں مصنوعی تھیں۔ وہ چاند نہیں تھا اندھیرا تھا۔ گلو سے ان معصوم انسانوں کو گلہ ہو چکا تھا۔ گلو بھی چہرہ پڑھنے کی صلاحیت رکھتا تھا وہ بے چارا ریت کی طرح پھسل گیا مصنوعی قلعے کی مانند ڈھے گیا پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔
پپڑی جمے ہونٹوں کو آنسو تر کر چکے تھے مگر تشنگی تا حال۔ اس نے لب کھولے انسان تو انسان لگتا تھا کہ ماحول پر بھی سوگواریت چھا گئی ہے۔
"گل شیر نام تھا میرا اماں شیر کہہ کر پکارتی تھی۔ مائیں کہاں جانتی ہیں کہ جن کے نام وہ شیر‘ عظمت‘ بلند رکھتی ہیں انہیں دنیا کتنی پستی میں گرا دیتی ہے۔ بلوچستان کے بہت بڑے وڈیرے کے گاؤں میں رہتا تھا اپنے بڑے بھائی کے ساتھ۔ ماں باپ کہنے کو تو ساتھ تھے مگر وڈیرے کے غلام اور وڈیرے کے نوکر چاکر نوکر کتنی دیر آزاد رہ سکتے تھے۔ کتنی دیر اپنی زندگی گزار سکتے تھے۔ میرے باپ نے ایک دن ایک بہت بڑی غلطی کر دی وڈیرے کے پالتو کتے کو باسی ہڈیاں ڈال دیں گناہ عظیم کر دیا (تمسخرانہ ہنسی) نتیجہ جانتے ہو کیا ہوا۔ اسی روز چند لمحوں بعد میرا بڑا بھائی اس کتے کا نوالہ بنا دیا گیا۔ ماں بن چادر کے روتی تڑپتی رہی۔ نو ماہ اس کی کوکھ میں پلنے والا بچہ ایک جنگلی کتے کا لقمہ بنا دیا

السلام علیکم

ہمیں اپنے نئے بلاگ (ویب سائیٹ) کے لئے رائٹرز کی
ضرورت ہے۔ اگر آپ میں سے کوئی ممبر ناول، افسانہ،
ناولٹ لکھنا چاہے تو ہم سے کانٹیکٹ کرسکتے ہیں۔ اپنی تحریر
اردو میں ٹائپ کر کے ہمیں بھیجیں۔ آپ کی بھیجی ہوئی
کوئی بھی تحریر ضائع نہیں کی جائے گی اور ایک ہفتہ کے
اندر پوسٹ کر دی جائے گی۔ مزید تفصیلات کے لئے ہمیں
ای-میل کریں یا ان بکس میں میسج کریں۔

شکریہ

Email Address: - aatish2kx@gmail.com

گیا تھا۔ حادثہ ایسا تھا کہ ماں ہوش و حواس سے بیگانی ہوگئی۔ کتے کو دلار کرنے لگی کہ یہ میرا بچہ ہے اس کے جسم میں میرے بچے کا خون ہے۔ باپ کے ضعیف ہاتھوں میں دوڑتی نسیں اسی لمحے بند ہوگئیں۔ ایک دن باپ کی قبر پر سر پھوڑتی ماں بھی چل بسی۔ مجھے عزیزوں نے اٹھایا اور حادثوں کا شکار بنادیا۔ ماں کے ممیرے یا چچیرے رشتہ دار تھے مگر میرے لیے سوتیلوں سے بھی بدتر ثابت ہوئے۔ مجھے فروخت در فروخت کیا گیا۔ سانحہ در سانحہ میرے بدن نے برتا۔ نجانے وہ میرا تیسرا مالک تھا یا دوسرا جس نے یہ حال کیا (وہ اپنے پیٹ سے قمیص ہٹاچکا تھا) اس کے پیٹ پر پڑے سگریٹ سے جلنے کے نشان انسانیت کا ماتم کررہے تھے۔ ہاں ایک وہ بھی تھا جو دن اور صبح کا کھانا دیتا تھا مگر اس لیے کہ رات کو میں خود اس کی خوراک بنتا تھا۔ کسی نے ہاتھ پاؤں توڑ کر مروڑ کر قیمں میں ایسے گھسا دیئے جیسے میں معذور ہوں اور سڑک پر بھیک مانگنے کے لیے کھڑا کردیا۔ کسی نے دنوں فاقوں میں رکھا۔ یہ جو میری گردن پر میل کے نشان ہیں یہ میل نہیں ہے یہ وہ گرم جلتا ہوا لوہا ہے جو میری گردن پر تب رکھا گیا جب میں نے فلاحی ادارے میں پناہ لینے کی سوچی (معصوم آنکھوں والا لڑکا اب عالم نظر آرہا تھا) یہ میری بدنصیبی کی کہانی نہیں ہے یہ شروعات ہے اختتام تک پہنچوں تو شاید لفظ لہو رنگ ہوجائیں۔ میرا مالک ویسے تو اللہ ہے مگر اب کی بار جو مالک بنا ہے وہ فجر سے لے کر سورج طلوع ہونے تک دوڑ لگواتا ہے تاکہ میں تھکا ہوا لگوں پھر صبح ہوتے ہی مجھے سفید پاؤڈر چٹا کر اپنے ساتھ ہاتھ تھام کر لے جاتا ہے بھیک مانگنے۔ وہ اندھا بنتا ہے اور میں ہاتھ پھیلاتا ہوں۔ کسی کو میری آنکھوں کے سرخ ڈوروں پر رحم آجاتا ہے کوئی پسینہ پسینہ ہوئی پیشانی پر نگاہ کرم ڈالتا ہے۔ دو چار سکے لے کر اس کے پاس واپس آتا ہوں تو وہ اپنی چھڑی میری ان آنکھوں پہ مارتا ہے کیل لگی چھڑی (اس نے درد سے آنکھیں میچ لیں) میں نیچے گر جاتا ہوں منہ کے سامنے دو نہیں تو کم از کم ایک سکہ مزید گر جاتا ہے۔ دوپہر تک یہ ڈرامہ چلتا ہے پھر کسی شادی ہال کے باہر جا کر کھانا مانگنے والوں کی قطار میں لگنا پڑتا ہے۔ روٹی کتوں کی طرح گھسیٹ کر میں لاتا ہوں کھاتا وہ ہے ہاں کبھی دو چار نوالے لٹل جاتے ہیں۔ شام کو بوجھ ڈھوتا ہوں۔ کارخانوں کا فرنیچر اتنی بڑی ریڑھیوں پر لادا ہوتا ہے اور میں گدھا اسے گھسیٹ رہا ہوتا ہوں۔ کبھی کیا کبھی کیا' کام یا بیگار۔ مشقت یا مصیبت۔ آفت یا محنت۔ جو بھی نام دیں میں وہی کررہا ہوتا ہوں آپ کے نزدیک مشقت اور میرے لیے قیامت' رات بھر یہ ڈیوٹی دینی ہوتی ہے اس نمکو کو بیچنے کی۔ اپنے ننگے پاؤں کا رونا رونے کی۔ کچھ تو ایسے اللہ والے ملتے ہیں جو اپنے جوتے اتار کر دے دیتے ہیں یہ انہی محسنوں کی دین ہے (اس نے بیگ کی طرف اشارہ کیا) اور کچھ ایسے بھی ملتے ہیں جو جوتا اتار کر منہ پر مارتے ہیں اور پھر دوبارہ اپنے پیر میں ڈال لیتے ہیں۔ اب آپ خود بتائیں میں کیا کروں میں کہاں جاؤں۔ مجھے دنیا سے جو مل رہا ہے میں دنیا کو وہی تو دے رہا ہوں میں اور کیا کرسکتا ہوں۔ ایسا نہ کروں تو زندگی چھین لے گا وہ ظالم۔" (وہ رویا' سسکا' تڑپ ہی تو گیا)۔

عبدالرشید اٹھا جیب سے دس دس کے تین نوٹ نکالے اور اٹھ کے چل دیا نوٹ پھینک کر۔ پیچھے پیچھے باقی تین ساکت نفوس بھی روتی بھیگی آنکھوں کے ہمراہ اٹھ کھڑے ہوئے۔ گل شیر ماں کا شیر دنیا کا گلو روتا رہا۔ نجانے کب تک آئینہ دیکھتا رہا اور لہولہان ہوتا رہا۔ پارک کی نسبتاً پُرسکون جگہ پر ایک معصوم انسان نجانے کب تک انسان ہوکر بھی انسانیت کا ماتم کرتا رہا۔ وہ روتا رہا۔